© rasailojaraid.com

جمہوریت اور اسلام کا سیاسی نظام

ایک تجزیہ

ڈاکٹر محمد ذکی

یوں تو "جمہوریت" ایک قدیم لفظ ہے جس کے مفہوم سے لوگ پہلے بھی آشنا رہے ہیں، لیکن یہ لفظ جتنا مشہور اور مقبول اس دور میں ہوا ہے اتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ آج اسے تہذیب و تمدن کی علامت بلکہ جزوِ لاینفک سمجھا جاتا ہے اور تقریباً ساری دنیا جمہوری طرزِ حکومت کو ایک نارمل اور فطری طرزِ حکومت کی حیثیت سے تسلیم کر چکی ہے۔ پرانی بادشاہتیں اب دم توڑ چکی ہیں یا توڑ رہی ہیں بیشتر ممالک میں جمہوری نظام قائم ہو چکا ہے، جہاں نہیں ہے وہاں اس کے لیے جدوجہد ہو رہی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تقریباً ایک صدی قبل دنیا نے جمہوریت سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ ابھی تک پوری نہیں ہو سکی ہیں یہی وجہ ہے کہ جگہ جگہ جمہوری نظام قائم ہو جانے کے باوجود لوگوں میں عام طور پر بے چینی پائی جاتی ہے۔

یہ توقعات کیوں پوری نہیں ہو سکیں؟ اس کی دو اہم وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جمہوریت کے علمبرداروں اور اس کا خیر مقدم کرنے والوں نے دراصل جمہوریت کا مفہوم ہی صحیح طور پر نہیں سمجھا تھا۔ انھوں نے "خوش فہمی" یا "غلط فہمی" سے یہ سمجھ لیا تھا کہ جمہوری نظام قائم ہوتے ہی دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں گی، ظلم و استحصال کا خاتمہ ہو جائے گا، ہر طرف عدل و انصاف اور آزادی و مساوات کا دور دورہ ہوگا، ہر شخص خوش حال اور مطمئن ہوگا۔ یہ ایک خواب تھا جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا، ٹھیک اس پیاسے کی طرح جو سراب کو دریا سمجھ کر اس کی طرف دوڑتا رہا اور پیاسا ہی رہا۔ یعنی جمہوری نظام قائم ہو جانے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ توقعات پوری ہو جائیں گی کیوں کہ اس کا قیام امن و آزادی کا ضامن نہیں۔[1]

---

[1] یہ تاثرات براؤن اور دوسرے مفکرین کے ہیں۔ ملاحظہ ہو "جمہوریت کا مفہوم" ۲۱، ۲۵، IVOR BROWN =

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ خرابی جمہوری نظام میں نہیں بلکہ اس کے قائم کرنے والوں میں ہے۔ یہ ان کی کوتاہی ہے کہ انھوں نے صحیح معنیٰ میں جمہوری نظام قائم ہی نہیں کیا ہے[۱۰] اگر آج بھی صحیح معنیٰ میں جمہوری نظام قائم ہوجائے اور اس کی راہ کی رکاوٹیں دور کردی جائیں اور ضروری اصلاحات کردی جائیں تو سب نہ سہی کم ازکم کافی حد تک لوگوں کی توقعات پوری ہوسکتی ہیں۔

لیکن جب تک اصل وجہ واضح نہیں ہوتی نہ تو جمہوریت کے بارے میں کوئی متوازن رائے قائم کی جاسکتی ہے اور نہ اصلاحی اقدام ممکن ہے۔

جن ماہرین سیاسیات نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابتدا ہی سے جمہوریت کا مفہوم واضح طور پر بیان نہیں کیا گیا، چنانچہ اس کے خدوخال نہایت مبہم رہے۔ اس کی اتنی مختلف اور مبہم تعریفیں بیان کی گئیں کہ ہر شخص نے اس کا جو مطلب چاہا سمجھ لیا۔ اور آج بھی صورت حال یہ ہے کہ ہر فریق اپنے تراشیدہ اور پسندیدہ نظام کو جمہوری نظام بتاتا ہے اور جو شخص بھی اسے قبول نہیں کرتا اسے جمہوریت کا دشمن بتادیتا ہے۔ ہر گروہ خود کو جمہوریت کا حامی اور علمبردار کہتا ہے اور دوسروں کو جمہوریت کا مخالف، ملک دشمن اور قوم دشمن سمجھتا ہے، جبکہ ان میں سے ہر گروہ کے نظریات اور اصول دوسروں سے بالکل مختلف ہیں۔ اب یہ فیصلہ کس بنیاد پر ہو کہ ان مختلف جماعتوں میں سے کون سی حقیقی معنیٰ میں جمہوریت کی حامی ہے[۱۲]

اگر جمہوریت اتنا وسیع المعنیٰ لفظ ہے کہ اس کا اطلاق ہر طرح کی حکومت اور ہر نوع کے نظام پر ہوسکتا ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ ایک ایسا لیبل ہے جو جب اور جہاں چاہے چپکا دیا جائے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کے نام پر اختلافات، بحثیں، تصادم، خوں ریزی اور "قربانیاں" کیوں؟

= The Meaning of Democracy, Bristol 1950

اور جیمس برائس "جدید جمہوریتیں"۔ ۴

James Bryce, Modern Democracies, London, 1929

[۱۱] یہ عام رائے ہے۔ دیکھئے برائس ۵۔۶ اور بیکر "جدید جمہوریت" ۶۔۸

Carl L. Becker, "Modern Democracy, U.S.A. 1959

[۱۲] اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، بیکر، "جدید جمہوریت" ۴۔۵؛ براؤں، ۱۳۔۲۷؛ واڈیا، "جمہوریت اور سوسائٹی" ۱۔

A.R. Wadia, Democracy and Society, Bombay. 1966

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جمہوریت اگر واقعی کوئی بامعنیٰ لفظ ہے، لیکن اس کے بارے میں غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں تو اس کی صحیح اور واضح تعریف بہت ضروری ہے تاکہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ اس طرزِ حکومت میں کیا کیا خوبیاں یا خامیاں ہیں؛ اس سے اب تک نوعِ انسانی کو کیا کیا فائدے یا نقصانات پہنچے یا آیندہ پہنچ سکتے ہیں اور اس کے کون کون سے گوشے اصلاح کے محتاج ہیں؟

جمہوریت کے معنیٰ اور عناصرِ ترکیبی

جمہوریت انگریزی لفظ ڈیماکریسی (Democracy) کا ہم معنیٰ ہے اور انگریزی لفظ یونانی لفظ ڈیماکریٹیا (Democratia) سے مشتق ہے جو دو لفظوں سے مل کر بنا ہے، یعنی ڈیماس (Demos) جس کے معنیٰ ہیں "لوگ" (The People) اور کریٹیا (Kratia) سے جس کے معنیٰ ہیں "طاقت" "اقتدار" (Power) پس ڈیماکریسی کے لفظی معنیٰ ہوئے "لوگوں کی طاقت"، "لوگوں کا اقتدار"۔ یعنی ایسا سیاسی نظام جس میں اقتدار کی باگ ڈور "لوگوں" کے ہاتھوں میں ہو نہ کہ فردِ واحد، یا چند لوگوں یا "شرفاء" کے ہاتھوں میں[1] لیکن یہاں "لوگوں" سے مراد ساری آبادی یا تمام مرد و عورت نہیں بلکہ صرف یونانی مرد مراد ہیں جو شہر کی مختلف کونسلوں میں شریک ہو سکتے اور اپنی رائے یا ووٹ دے سکتے تھے، بالفاظِ دیگر جنہیں "شہری حقوق" حاصل تھے۔ یونانی عورتیں، شہروں میں آباد غیر یونانی اور کثیر تعداد میں بسے ہوئے غلام "شہری حقوق" سے محروم تھے اس لیے سیاسی اعتبار سے ان کا شمار "لوگوں" میں نہیں ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایتھنز (جسے جمہوریت کا گہوارہ کہا جاتا ہے) کی آبادی تقریباً دو لاکھ تیس ہزار تھی، لیکن شہری حقوق صرف تیس ہزار افراد ہی کو حاصل تھے۔

معلوم ہوا یونانیوں کا تصورِ جمہوریت بہت محدود تھا جس میں تمام لوگوں کو شہری حقوق حاصل نہیں تھے بلکہ آبادی کا صرف ایک حصہ ہی انتظامی امور میں شریک تھا۔ اس اعتبار سے اس پر "جمہوریت" کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ جمہور (بمعنی عوام، پبلک) کی حکومت نہیں تھی۔

---

[1] اگر فردِ واحد حکمراں ہوتا تو یونانی اسے مونارکی (Monarchy)، چند لوگ برسرِ اقتدار ہوتے تو اسے آلی گیرکی (Oligarchy) اور اگر شرفاء کا طبقہ حکمراں ہوتا تو اسے ایرسٹاکریسی (Aristocracy) سے تعبیر کرتے تھے۔ دیکھئے، براؤن، ۲۹۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن ایتھنز ہی کیا، بیسویں صدی کے اوائل تک نہ صرف یورپ کے تمام ممالک بلکہ خود برطانیہ میں بھی ووٹ کا حق تمام لوگوں کو نہیں تھا۔ البتہ پہلی عالمگیر جنگ (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے بعد ہر بالغ مرد اور عورت کو حق رائے دہندگی حاصل ہو گیا تاہم بہت سے ایشیائی اور افریقی ممالک میں یہ حق عام طور پر دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کے بعد ملا ہے۔

چنانچہ اب جمہوریت کا مفہوم کافی وسیع ہو گیا ہے اور اب اس کا اطلاق ایسی حکومت پر ہونے لگا ہے جس میں سیاسی اقتدار کا منبع لوگ (جمہور) ہوں اور لوگ ہی رہیں، جس میں شہری (وسیع معنی میں۔ بالغ مرد اور عورت) یا اُن کی خاصی تعداد۔ جو کم و بیش عوام کی مرضی کی نمائندگی کرتی ہو، آزادانہ کام کرے اور مقررہ قوانین کے مطابق حکام کا تقرر کرے اور انھیں برطرف بھی کر سکے اور ایسے قوانین بنائے جن سے معاشرے کی تنظیم ہو۔[۱]

جمہوریت کے ارکانِ خمسہ

اس تعریف کی رو سے جمہوریت کے پانچ اہم ارکان سمجھ میں آتے ہیں۔

(۱) اقتدار کا منبع لوگ ہوں یعنی اصل سیاسی طاقت کے مالک لوگ ہوں اور وہی رہیں یعنی اگر حکمرانی کا حق کسی کے سپرد کر دیں تو واپس لینے کا بھی اختیار رکھتے ہوں۔

(۲) لوگ مختار کل اور مکمل طور پر آزاد ہوں، یعنی اُن پر کوئی بیرونی یا ماورائی طاقت حکمراں نہ ہو بلکہ یہ خود ہی حاکم اعلیٰ ہوں، جو چاہیں کر سکیں، دوسرے ان کے سامنے جوابدہ ہوں یہ کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہوں۔

(۳) حکومت ان کی مرضی کے مطابق ہو اور ان کی مرضی کا اظہار بغیر کسی دباؤ کے واضح اور آزادانہ طور پر ہو۔

(۴) حکام کا تقرر لوگوں کی مرضی اور ان ہی کے نمایندوں کے ذریعہ ہو اور حکام اسی وقت تک اپنے عہدوں پر فائز رہیں جب تک انھیں لوگوں کا اعتماد حاصل رہے۔ ورنہ انھیں اقتدار

۱؎ بیکر (۷) وغیرہ۔ اس سلسلے میں امریکن صدر لنکن سے منسوب جمہوریت کی یہ تعریف کافی مشہور ہے کہ جمہوریت "لوگوں کی حکومت، لوگوں کے لیے اور لوگوں کے ذریعہ" کا نام ہے (The government of the people, for the people by the people.)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسروں کے سپرد کرنے کا حق حاصل رہے، اور

(۵) ملک کا انتظام چلانے کے لیے جو قوانین چاہیں یہ وضع کر سکیں، اور جب جس قانون کو چاہیں بدل سکیں، یعنی قانون سازی کے معاملے میں مکمل طور پر آزاد ہوں، ان پر کوئی خارجی دباؤ یا پابندی عائد نہ ہو۔

یہ تو ہوئی جمہوریت کی نظریاتی تعریف، اس کا لفظی یا مثالی (آئیڈیل Ideal) خاکہ؛ لیکن اس کی عملی شکل کیا رہی ہے اور ہے، یعنی کیا ان خصوصیات کے ساتھ کبھی کہیں جمہوریت قائم ہوئی ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب حوصلہ افزا یعنی اثبات میں نہیں ملتا، اور اسی وجہ سے بہت سے لوگوں کو جمہوریت سے ناامیدی ہوگئی ہے۔ مذکورہ بالا خصوصیات کے ساتھ یا آئیڈیل کے مطابق جمہوریت کا قیام عمل میں کیوں نہیں آیا، اس کی پھر وہی دو وجہیں ہوسکتی ہیں، یعنی ایک تو یہ کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اپنے تمام عناصر کے ساتھ جمہوری نظام قائم ہو جائے[1] اس میں خامیاں ہیں اور رہیں گی جو کبھی دور نہیں ہوسکتیں، یا پھر یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ اس سلسلے میں پوری کوشش ہی نہیں کی گئی، اور جو خامیاں نظر آرہی ہیں انھیں اگر سنجیدگی کے ساتھ دور کرنے کی سعی کی جائے تو دور ہوسکتی ہیں اور اصلاح کے بعد اگر آئیڈیل کے مطابق نہ بھی ہو تو کم از کم اس کے قریب قریب جمہوریت قائم ہوسکتی ہے۔

آئیے اب ذرا اس کا تفصیلی جائزہ لیں۔

طاقت (اقتدار اعلیٰ) کیا جمہور کے ہاتھوں میں ہے؟

اصل طاقت کس کے پاس ہے، حکومت کی باگ ڈور واقعی کس کے ہاتھ میں ہے، یعنی حقیقتاً حاکم کون ہے، کس کا حکم چلتا ہے، قانون کون اور کس کی مرضی سے بناتا ہے، یہ معلوم کرنا کچھ دشوار نہیں کیوں کہ ہر ملک میں ایک یا ایک سے زیادہ افراد کی بآسانی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو قانون بناتے ہیں، آج کل عام طور پر اس ادارے کو پارلیمان (Parliament) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اگرچہ اس کے مقامی نام مختلف ہیں۔ یہ مجلسِ قانون ساز (مقننہ) کچھ افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔

---

[1] بیکر اور بہت سے دوسرے مفکرین کا کہنا تو یہ ہے کہ کسی بھی آئیڈیل کے مطابق کوئی نظام یا ادارہ اس دنیا میں قائم نہیں ہوا۔ دیکھیے "جدید جمہوریت" ۵، ۳۴۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو (بظاہر) خود مختار، پوری طرح آزاد ہوتے ہیں اور ان کے پاس یہ اختیار ہوتا ہے کہ ملک کے لیے جو قانون چاہیں بنائیں، جس قانون کو چاہیں بدل یا ختم کر دیں یہی مجلس حکام کا تقرر کرتی ہے اور تمام حکام اس کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں بالفاظ دیگر پارلیمان ہی کے پاس تمام طاقت ہوتی ہے اور یہی انتظامیہ اور عدلیہ کو کنٹرول میں رکھتی ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ آج کل بیشتر ممالک میں سیاسی طاقت یا اقتدار پارلیمان کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اور یہی جمہوریت کی علامت ہے۔

کیا اقتدار کا چند ہاتھوں میں مرکوز ہونا جمہوریت کے منافی نہیں؟

جیسا کہ ابھی ہم نے جمہوریت کی بنیادی خصوصیات میں دیکھا کہ اقتدار لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے یعنی جمہور کے ہاتھوں میں، لیکن عملاً ہم دیکھ رہے ہیں کہ ساری طاقت پارلیمان کے ہاتھ میں ہے جو گنتی کے کچھ لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے، تو کیا اب بھی "لوگوں" اور "جمہور" سے مراد صرف چند لوگ ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سیاسی اقتدار ہے تو سب لوگوں کے پاس، اور سب ہی لوگ اس میں برابر کے شریک ہیں لیکن عملاً سب ہی لوگ اس طاقت کا استعمال نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ملک تو خیر بہت بڑی چیز ہے، ایک شہر ہی کے تمام لوگ ایک جگہ جمع ہو کر، سب مل کر، حکومت کا نظام نہیں چلا سکتے۔ بھلا سوچئے تو سہی لاکھوں انسان کہاں جمع ہوں گے، یہ سب مل کر کس طرح قوانین بنائیں گے اور پھر یہ ایک دن کا کام نہیں، ہر روز کوئی نہ کوئی مسئلہ درپیش ہوگا، یہ لاکھوں آدمی ایک جگہ کس طرح جمع ہو کر یہ مسائل طے کریں گے؟ پس عملاً تو یہ ناممکن ہے کہ سب ہی لوگ طاقت کا اظہار و استعمال کر سکیں۔

اس لیے اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد براہ راست سیاسی طاقت کا استعمال کر سکتا ہے تو وہ مغالطے میں مبتلا ہے، ایسا عملاً ہو ہی نہیں سکتا، اور اگر کسی نے یہ توقع قائم کی تھی تو غلطی کی تھی، ایک "مہمل سا" خواب دیکھا تھا جو اس دنیا میں کبھی شرمندۂ تعبیر ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔

اقتدار جمہور کے نمائندوں کے ہاتھ میں

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جمہور کے پاس طاقت نہیں یا وہ اس کا استعمال نہیں کرتے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا پارلیمان ہی اقتدار اعلیٰ کی مالک ہوتی ہے جس کے اوپر کوئی طاقت نہیں ہوتی۔ بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ چونکہ تمام لوگ اس طاقت کا استعمال کرہی نہیں سکتے اس لیے وہ اپنی اس طاقت اور اختیار کو اپنے نمائندوں کو تفویض کر دیتے ہیں اور یہ نمائندے جمہور کی طرف سے طاقت کا استعمال کرتے ہیں اور جب بھی جمہور چاہیں اس طاقت کو واپس لے کر جسے چاہیں دے سکتے ہیں۔ یعنی الیکشن کے ذریعہ اپنا ووٹ دے کر جس پارلیمان کو چاہیں برطرف کر دیں اور جسے چاہیں چن کر برسر اقتدار لے آئیں۔ اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ ہر ملک میں دو طرح کا اقتدار ہوتا ہے ایک تو قانونی، ظاہری، عارضی یا میعادی اور دوسرا اصلی اور اعلیٰ پہلا پارلیمان کے پاس اور دوسرا جمہور کے پاس۔ اس کو زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہری طور پر اور عملاً سارا اختیار اور اقتدار قانون ساز اسمبلی یا پارلیمان کے پاس ہوتا ہے، اور استعمال کے وقت اس پر کوئی روک نہیں ہوتی اسے مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے، اس کے اختیارات لامحدود ہوتے ہیں، یہ جو چاہے کر سکتی ہے۔ لیکن یہ ادارہ خود مختار اور مکمل آزاد اسی وقت تک ہوتا اور رہتا ہے جب تک اسے جمہور کی حمایت حاصل ہوتی ہے، جب تک یہ مجلس جمہور کی مرضی کے مطابق حکومت کرتی ہے۔ پس اس اقتدار اعلیٰ کو حرکت دینے والے دراصل جمہور ہیں۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ ہاتھ میں تو دراصل جمہور کے ہے اور رہتا ہے لیکن اس کا استعمال پارلیمان کرتی ہے۔

پس جمہوریت کی روح یہ نہیں کہ اقتدار اعلیٰ جمہور کے ہاتھوں استعمال ہو بلکہ اس کا استعمال جمہور کے نمائندے جمہور کی مرضی کے مطابق کریں [۱]۔

کیا جمہور کے نمایندے واقعی جمہور کی نمایندگی کرتے ہیں؟

یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر جمہور اپنا اختیار اپنے نمایندوں کے سپرد کر دیں اور عملی دشواریوں کے پیش نظر اپنے نمائندوں کے ذریعہ اپنے اختیار کا استعمال کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اور اگر جمہور کے نمایندے واقعی جمہور کی مرضی، ان کی خواہشات اور نظریات کے مطابق حکومت کریں تو جمہوریت کی یہ بنیادی شرط پوری ہو جاتی ہے کیونکہ اس دنیا میں تو کم از کم یہی ممکن ہے اس سے زیادہ کی توقع رکھنا خوش فہمی سے زیادہ کچھ نہیں یعنی یہ امید رکھنا یا سوچنا کہ ہر شخص

---

[۱] یہ توضیحات براؤن کی "جمہوریت کا مفہوم" ۲۳۔ ۲۶، ۵۹ واڈیا، ۶ سے ماخوذ ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

با اختیار ہو اور براہ راست طاقت کا استعمال کر سکے۔

پس اصل مسئلہ یہ ہے کہ حکومت جمہور کی مرضی کے مطابق قایم ہو اور قایم رہے۔ اس کے لیے تین باتیں ضروری ہیں۔

ایک تو یہ کہ جمہور یا عوام میں سیاسی شعور بیدار ہو۔ ان کی اپنی مرضی ہو اور ان کے اندر یہ خواہش موجود ہو کہ اُن کی مرضی کے مطابق اور فلاح کے لیے حکومت قایم ہو، وہ سوئے ہوئے اور بے خبر و لاپروانہ ہوں کہ جو بھی اُن پر جس طرح چاہے حکومت کرتا رہے اور وہ خاموش رہیں اور ظلم و زیادتی کو بھی گوارا کرتے رہیں۔

دوسری اہم شرط یہ ہے کہ عوام اپنی مرضی کا آزادی کے ساتھ اظہار بھی کر سکیں اور اس معاملے میں ان پر کسی قسم کا دباؤ نہ ہو۔

تیسری اور بہت اہم شرط یہ ہے کہ جس جماعت، گروہ یا مجلس کو وہ منتخب کریں وہ ان ہی کی مرضی کی پابند بھی رہے، ایسا نہ ہو کہ اختیار مل جانے کے بعد جمہور کی خواہشات کو پامال کرنے لگے اور ان کی مرضی اور رائے کی پروا نہ کرتے ہوئے من مانی کرنے لگے، یعنی عوام کے نمایندے یا خدمت کرنے والے حاکم اور مطلق العنان نہ بن جائیں۔

دراصل جمہوریت کے قیام میں یہی مسائل بہت دشوار بھی ہیں، کیونکہ جب ان اصولوں کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے تو پھر اس کے نتائج حوصلہ افزا نہیں نکلتے بلکہ جمہوریت کی روح ہی کے منافی نظر آتے ہیں۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کسی ملک یا معاشرے میں عوام سیاسی شعور رکھتے ہیں، تو پھر اس کا آزادی کے ساتھ اور موثر طریقے سے اظہار کس طرح کریں؟ اس کی عملی صورت صرف یہی ہے کہ اپنے ووٹ کا استعمال کریں، اسی کے ذریعہ وہ موثر طور پر اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔

رائے عامہ اور الیکشن

اب اس حق کا استعمال کس طرح ہوتا ہے اور اس کے ذریعۂ جمہور کی مرضی کا اظہار کس حد تک ہوتا ہے، ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) مان لیا جائے کہ عوام میں سیاسی شعور بیدار ہے اور آزادی کے ساتھ ووٹ دینے کا حق استعمال کرتے ہیں، الیکشن ہوتا ہے، ملک آبادی کے لحاظ سے مختلف حلقوں (Constituencies) میں بانٹ دیا جاتا ہے اور قانون ساز اسمبلی یا پارلیمان کے لیے ہر حلقے سے ایک ممبر منتخب ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مختلف پارٹیاں میدان میں آتی ہیں اور ہر حلقے سے اپنے اپنے امیدوار کھڑے کرتی ہیں، کچھ لوگ آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑتے ہیں۔

فرض کیجئے ہر حلقے میں کم وبیش ایک لاکھ ووٹر ہیں جن کے بارے میں توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ووٹ دیں گے لیکن عام طور پر تقریباً ساٹھ فی صد لوگ ہی اپنے اس حق کو استعمال کرتے ہیں۔ اب فرض کیجئے ان ساٹھ ہزار افراد نے مختلف امیدواروں کو کچھ اس طرح ووٹ دیئے۔

امیدوار	تعداد ووٹ	
ا	۲۵،۰۰۰	(پچیس ہزار)
ب	۲۰،۰۰۰	(بیس ہزار)
ج	۱۰،۰۰۰	(دس ہزار)
د (آزاد)	۵،۰۰۰	(پانچ ہزار)

الیکشن کا جو موجودہ قانون ہے اس کی رو سے 'ا' کامیاب منتخب امیدوار کہلائے گا اور وہی پارلیمان کا ممبر قرار دیا جائے گا۔ لیکن جہاں تک نمائندگی کا تعلق ہے وہ اپنے حلقے کی چوتھائی آبادی یعنی کل پچیس ہزار افراد کی نمائندگی کرے گا۔ باقی تین چوتھائی (۷۵،۰۰۰) لوگوں کی پارلیمان میں نمائندگی نہیں ہوگی۔ اور اگر پورے ملک میں الیکشن اسی انداز سے لڑا گیا ہے تو ظاہر ہے وہاں کی پارلیمان ملک کی صرف چوتھائی آبادی کی نمائندگی کرسکے گی اور یہ صریحاً جمہوریت کے بنیادی اصول کے منافی ہے کہ اکثریت کے نمائندے ہوں نہ ان کی کوئی آواز ہو نہ انھیں حکومت میں کوئی اختیار حاصل ہو بلکہ یہ تو وہی بات ہوگئی کہ چند لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آگئی۔

بقول براؤن یہ فرضی صورت حال نہیں بلکہ انگلینڈ میں متعدد بار ایسا ہو چکا ہے بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کم ووٹ پانے والی جماعت کامیاب ہوگئی اور زیادہ ووٹ پانے والی پارٹی الیکشن ہار گئی [۱]

یہ صورتِ حال کچھ اس طرح ہوسکتی ہے۔ مثلاً کسی الیکشن میں ووٹوں کی گنتی کچھ اس طرح ہو:

پارٹی	حلقہ ۱	حلقہ ۲	حلقہ ۳	حلقہ ۴	حلقہ ۵
ا	۹۰۰۰	۷۰۰۰	۹۰۰۰	۱۰،۰۰۰	۵،۰۰۰
ب	۸۰۰۰	۱۰،۰۰۰	۸۰۰۰	۸۰۰۰	۱۰،۰۰۰
ج	۲۰۰۰	۲۰۰۰	۱۰۰۰	۱،۵۰۰	۴،۰۰۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

د ۱۰۰۰ ۱۰۰۰ ۲۰۰۰ ۵۰۰ ۱،۰۰۰

نتیجہ کے اعتبار سے 'ا' پارٹی کامیاب مانی جائے گی اور اسی کی اکثریت پارلیمان میں ہوگی اگرچہ اس نے ۴۰،۰۰۰ ووٹ حاصل کیے اور 'ب' ناکام رہے گی حالانکہ اس نے چوالیس ہزار (۴۴،۰۰۰) ووٹ حاصل کیے ہیں یعنی کامیاب پارٹی سے چار ہزار زیادہ، بظاہر تو 'ب' زیادہ لوگوں کی نمایندگی کر رہی ہے لیکن حکومت بنانے کا اختیار اس پارٹی کو حاصل ہوگا جو ایک اقلیت کی نمایندگی کر رہی ہے[1]

اگر الیکشن اس انداز پر ہو، اور ووٹوں کی تقسیم کی یہی نوعیت پورے ملک میں رہے تو یہ اقلیت کی حکومت ہوگی جمہوریت ہرگز نہیں کہی جاسکتی۔

(۲) اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو پارٹی ہار جاتی ہے چاہے وہ جیتنے والی سے زیادہ آبادی کی نمایندگی کیوں نہ کرتی ہو، پارلیمان میں "اقلیت" میں رہ جاتی ہے اور عملاً بالکل بے اثر ہو جاتی ہے۔ وہاں ووٹ کی حد تک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی کیوں کہ جو پارٹی پارلیمان میں اکثریت میں ہوتی ہے وہی جو قانون چاہتی ہے بناتی ہے، اور جس طرح کی حکومت چاہتی ہے قایم کرتی ہے، جو پارٹیاں وہاں اقلیت میں ہوتی ہیں وہ مجبور تماشائی کی طرح دیکھتی رہتی ہیں۔

(۳) کابینہ (عاملہ) کی تشکیل اور مناصب کی تقسیم میں دوسری تمام پارٹیوں کا نہ کوئی دخل ہوتا ہے نہ کابینہ میں ان کی کوئی نمایندگی ہوتی ہے۔ اب اگر ان پارٹیوں میں کچھ باصلاحیت لوگ ہوتے بھی ہیں تو ملک ان کی خدمات سے محروم رہ جاتا ہے۔

(۴) اور بقول براؤن، ملک میں جو جماعتیں اقلیت میں ہوتی ہیں ان کے تو نمایندے منتخب بھی نہیں ہوتے اور وہ کس مپرسی کے عالم میں رہ جاتی ہیں۔ الیکشن کے موجود ڈھانچے میں ممکن ہے ہزاروں افراد ایک خاص نظریے کے علمبردار ہوں اور ہر حلقے میں ایسے افراد موجود ہوں تو یہ بالکل ممکن ہے کہ پارلیمان میں ان کا ایک نمایندہ بھی منتخب ہو کر نہ پہنچ سکے، ظاہر ہے، بقول براؤن، یہ ووٹرز کے ساتھ بھی ناانصافی ہے اور اس میں ملک کا بھی نقصان ہے، اور یہ تو اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ اقلیت کی وہ اہمیت تو بہر حال ہے جو کھانے میں نمک کی ہوتی ہے[2]

(۵) موجودہ نظام کے تحت پارلیمان میں جو پارٹی اقلیت میں ہوتی ہے اسے "حزب مخالف"

---

[1] براؤن نے اس پہلو پر بھی متنبہ کیا ہے (۶۳)

[2] ایضاً، ۶۴-۶۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(Opposition Party) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ پارٹی جب یہ دیکھتی ہے کہ نہ تو اسے حکومت میں کوئی دخل ہے، نہ قانون سازی میں کوئی اختیار حاصل ہے، نہ اس کی بات سنی جاتی ہے۔ تو وہ جائز یا ناجائز طور پر برسر اقتدار پارٹی کی مخالفت ہی کو اپنا شعار بنالیتی ہے اور پھر اپنے نظریات کو بروئے کار لانے اور اپنے طرز کی حکومت قائم کرنے کے لیے اسی جد وجہد میں لگ جاتی ہے کہ کسی طرح موجود حکومت بدنام ہوجائے، جمہور یا عوام اس سے بدظن ہوجائیں، اس پر سے اعتماد اور اعتبار اٹھ جائے۔ پھر جب دوبارہ الیکشن ہو تو یہ پارٹی ہار جائے اور ہم برسر اقتدار آجائیں یہی نفسیات برسر اقتدار پارٹی اور دوسری پارٹیوں کے تعلقات میں کارفرما رہتی اور انھیں تلخ اور تلخ تر کرتی رہتی ہے۔ اور پھر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بھی کسی دوسری پارٹی کے ممبر کی معقول بات بھی سننا گوارا نہیں کرتا اور نتیجہ میں اقتدار کے لیے ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش شروع ہوجاتی ہے۔

(۶) ایسا نہیں کہ سیاسی مفکرین اس تشویش ناک پہلو سے بے خبر ہیں، بلکہ انھیں اس کا احساس ہے اور چاہتے ہیں کہ الیکشن کے موجودہ ڈھانچے میں کچھ اس طرح اصلاح ہو کہ ملک کی کم از کم بیشتر آبادی کی نمایندگی ہوجائے اور پارلیمان کم از کم اکثریت ہی کی مرضی اور ان کی رائے کی آئینہ دار ہوجائے، نیز اقلیتوں کی بھی مناسب نمائندگی ہوسکے[1]

کیا ووٹوں کی تعداد واقعی عوام کی مرضی کی آئینہ دار ہوتی ہے؟

اسی سے منسلک ایک اور اہم مسئلہ بھی ہے، وہ یہ کہ جمہور کیا واقعی اپنی ہی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور اس معاملے میں ان پر خارجی دباؤ تو نہیں ہوتا؟ اس کا تجزیہ کرتے ہوئے براؤن نے لکھا ہے کہ عوام تو عام طور پر قدامت پسند ہوتے ہیں وہ کسی بھی نئی بات میں دلچسپی اسی وقت لیتے ہیں جب وہ بات ان کے سامنے مسلسل دہرائی جاتی رہتی ہے۔ بالفاظ دیگر رائے عامہ کی تشکیل افراد ہی کرتے رہے ہیں۔ پہلے لوگ گھوم پھر کر اور اپنی تقریروں سے لوگوں کو متاثر کیا کرتے تھے یا پھر کوئی بات ایک دوسرے سے کہتا اور یوں وہ دور تک پھیل جاتی تھی، لیکن اب خیالات اور نظریات کی اشاعت کے جدید طریقے رائج ہوگئے ہیں اور اب ان کے ذریعہ عوام کی رائے بنائی جاتی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو براؤن ۶۵ - ۶۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موجودہ جمہوری نظام میں الیکشن پارٹی کی بنیاد پر لڑا جاتا ہے یعنی بہت کم افراد "آزادانہ انتخاب" کی بنیاد پر ووٹ حاصل کرتے ہیں، اکثریت انہی کی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی پارٹی سے منسلک ہوتے ہیں۔ ہر پارٹی کے اپنے نظریات ہوتے ہیں اس کا ایک مخصوص پروگرام یا مینی فیسٹو (Maenifesto) ہوتا ہے، اسی کو وہ عوام کے سامنے رکھتی ہے اور چاہتی ہے کہ عوام افراد کو نہیں بلکہ اسے بہ حیثیت ایک پارٹی کے ووٹ دیں۔

ہر پارٹی تنظیم کی محتاج ہے، اور تنظیم کے لیے دولت کی ضرورت ہے، اس لیے اسے کسی نہ کسی "سرمایہ دار" کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ بہت سے سرمایہ دار اپنا سرمایہ لگا کر پارٹیوں کو قائم کرتے اور انھیں چلاتے ہیں، اور جب وہ سرمایہ لگاتے ہیں تو ظاہر ہے اس امید پر لگاتے ہیں کہ ان کی پارٹی کے ممبران پارلیمان میں جا کر ان کے مفادات کا تحفظ کریں گے۔ نتیجہ ظاہر ہے، پارٹی کا پروگرام اور سارا نظام بالآخر چند دولت مندوں کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے جو پارٹی کو "غذا" فراہم کرتے ہیں۔ یہ پارٹیاں اب عوام اور جمہور کی مرضی کی نمایندگی نہیں کرتیں بلکہ ان کی مرضی کی ترجمانی کرتی ہیں جو اپنے ہی مفاد کے لیے انھیں قائم رکھتے ہیں۔ بظاہر یہ عوام کی "خدمت" کے لیے قایم ہوتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ عوام پر "آقائی" کرنے لگتی ہیں۔[1]

اسی طبقہ کے ہاتھ میں پروپیگنڈا مشینری ہوتی ہے، یہی چند لوگ بتدریج پریس کو کنٹرول کر لیتے ہیں اور خبروں، اشتہارات، کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ اپنے نظریات عوام کے ذہنوں میں اتار دیتے ہیں۔ اس طرح ووٹوں کے ذریعہ اپنی کامیابی کی راہ ہموار کر لیتے ہیں۔[2]

اس لیے اس شعبے میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے تاکہ پارٹیاں واقعی جمہوری خطوط پر کام کر سکیں، عوام کی نمایندگی کریں اور عوام ہی کے کنٹرول میں رہیں نہ کہ چند افراد یا سرمایہ داروں کے۔

کیا انتخاب کے بعد جمہور کے ہاتھ میں اختیار باقی رہتا ہے؟

ان تمام مراحل کے گزر جانے اور ضروری اصلاحات کے باوجود بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا کیوں کہ جمہوریت کے لیے اتنا ہی کافی نہیں کہ جمہور اپنی مرضی کے مطابق اپنے نمایندوں کو منتخب کر دیں اور حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے دیں بلکہ ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ ان

---

[1] دیکھئے براؤن، ۶۷-۶۸ [2] ایضاً، ۳۹-۴۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نمایندوں پر اپنی گرفت بھی مضبوط رکھیں تاکہ یہ اگر بہکیں تو انھیں برطرف بھی کرسکیں، ایسا نہ ہو کہ "خادم" "مخدوم" بن جائے اور بنا رہے۔ اور اگر ایسا ہوا تو بہت ہی خطرناک ہوگا کیوں کہ عوام کے منتخب نمایندے جو پارلیمان کے ممبر ہوتے ہیں دراصل سیاہ وسفید کے مالک بن جاتے ہیں، قانون کی رو سے عوام اپنے تمام اختیارات ان کو سونپ دیتے ہیں، اس توقع پر کہ یہ عوام کی مرضی کے مطابق نظامِ حکومت چلائیں گے۔ اگر یہ اپنے وعدوں سے پھر جائیں اور اس سے بڑھ کر ایسے اقدامات کرنے لگیں جو عوام کی مرضی کے خلاف ہوں تو یہ بدترین حکمراں ہوں گے اور ایک ظالم وجابر فرماں روا سے بھی زیادہ خطرناک ہوں گے کیونکہ انھیں قانون کی حمایت حاصل رہے گی۔ اخلاق کی نظر میں یہ ظالم ہو سکتے ہیں، لیکن قانون کی نظر میں نہیں کیوں کہ قانون کی رو سے یہی حاکم اعلیٰ ہوتے ہیں اور انھیں لامحدود اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

قانونی صورت یہ ہے کہ پارلیمان جو قانون چاہے بنا سکتی ہے یہاں تک کہ ملک کے دستور کو مسترد کردے اور اپنی مرضی کے مطابق ایک نیا دستور بنا دے یہ سب قانون کے دائرے میں ہوگا، کوئی پارلیمان سے باز پرس نہیں کرسکتا۔

ووٹروں (یعنی جمہور) کو ایسی پارلیمان کے خلاف بغاوت کا قانونی حق نہیں، اگر انھوں نے ایسا کیا تو صریحاً خلاف قانون ہوگا، ان کا کام اور فرض یہی ہے کہ پارلیمان کے ہر فیصلے کے سامنے سرِتسلیم خم کردیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتے ہیں کہ آیندہ الیکشن میں ان ممبران کو ووٹ نہ دیں لیکن پارلیمان کو یہ قانونی حق بھی حاصل ہے کہ الیکشن کو غیر معینہ مدت تک کے لیے ملتوی رکھے اور من مانی کرتی رہے۔[۱]

جب قانونی صورت یہ ہو تو ظاہر ہے ان ممبران پر عوام کی کسی نہ کسی طرح گرفت رہنی چاہیے ورنہ جمہوریت ایک بدترین حکومت بن جائے گی۔

اس سلسلے میں اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی کچھ ایسے اصول ہیں جن کو بہرحال عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکتا اور اس صورت حال کو عوام کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر قبول کرنا ہی ہوگا، مثلاً:۔

توقع یہ کی جاتی ہے کہ ممبران پارلیمان جنھیں عوام منتخب کرکے بھیجیں وہ قانون بناتے وقت

---

[۱] ملاحظہ ہو براؤن، ۳۳۰-۳۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ان کو نافذ کرنے میں عوام کی مرضی کو ملحوظ رکھیں۔ اس کی عملی شکل یہی ممکن ہے کہ ہر ممبر اپنے حلقے کے ووٹروں سے رابطہ قایم رکھے، ان سے مشورہ کرتا رہے اور ووٹ دینے اور کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ ان لوگوں کی کیا رائے اور مرضی ہے جنھوں نے اس ممبر کو اپنا نمایندہ بنا کر بھیجا ہے۔ اگر پارلیمان میں بحث کے دوران اور ووٹ دینے کے وقت اس نے حلقے کے لوگوں کی مرضی کے مطابق اپنی رائے دی تو کہا جا سکتا ہے کہ اس نے صحیح نمایندگی کر دی۔

اس کی عملی صورت یہ ہوتی ہے کہ الیکشن کے وقت کچھ ایسے مسائل سامنے ہوتے ہیں جن کے بارے میں کسی مخصوص حلقے کے لوگوں کی عام طور پر رائے ظاہر ہوتی ہے اور اکثر ایسے ہی مسائل پر الیکشن لڑا بھی جاتا ہے۔ مثلاً کسی حلقے میں پانی اور بجلی کا مسئلہ زیادہ اہم ہے یا کسانوں اور مزدوروں کی کچھ پریشانیاں ہیں، یا قیمتوں میں کمی کا مسئلہ یا کسی خاص طبقے کے تحفظِ حقوق کا مسئلہ ان مسائل کو ابھار کر امیدوار اسی حلقے کے لوگوں کی حمایت کی اپیل کرتا ہے اس وعدے کے ساتھ کہ اگر وہ منتخب ہو گیا تو ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرے گا۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قومی نقطۂ نظر سے بعض مسائل اہمیت اختیار کر جاتے ہیں مثلاً آزادی اور ملک کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہوتا ہے اور امیدوار اسی مسئلہ کو ابھار کر الیکشن لڑتے ہیں یعنی جانتے ہیں کہ عوام کیا چاہتے ہیں۔

لیکن جب پارلیمان کا اجلاس ہوتا ہے اور طرح طرح کے مسائل سامنے آتے ہیں تو اس وقت نمایندوں کے لیے عملاً ناممکن ہو جاتا ہے کہ ہر ہر مسئلہ پر اپنے اپنے حلقے کے لوگوں سے رابطہ قائم کریں اور ان کی رائے معلوم کریں۔ ان نئے مسائل کا تعلق کسی خاص حلقے سے بھی ہو سکتا ہے اور پوری قوم سے بھی اور ان پر فیصلہ کرنا بھی ہوتا ہے۔ اتنا وقت مل ہی نہیں سکتا کہ جب بھی کوئی نیا مسئلہ درپیش ہو تو دوڑ دوڑ کر ممبران اپنے اپنے حلقوں میں عوام کی مرضی معلوم کرنے جائیں اور اجلاس میں شریک ہوں۔ لہٰذا یہ تو ناممکن ہے کہ ممبران پارلیمان ہر ہر مسئلہ پر (چاہے کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو) عوام کی رائے معلوم کرنے اور ان کی تائید حاصل کرنے کے لیے بار بار جائیں۔ اب صرف یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ وہ بروقت فیصلہ کریں اور جس قدر بھی ممکن ہو اپنے ووٹروں کی مرضی کا خیال رکھیں۔ لیکن اکثر ایسا بھی نہیں ہوتا اس کی مختلف وجہیں ہو سکتی ہیں، مثلاً

(۱) ممبران الیکشن کے وقت کیے ہوئے وعدے اکثر "بھول" جاتے ہیں۔

(۲) ان ممبروں کے اپنے ذاتی مفادات بھی ہوتے ہیں اس لیے انھیں اپنے ووٹروں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی مرضی کو بہر حال قربان کرنا ہی پڑتا ہے۔

(۳) کبھی کبھی پارٹی کا اتنا دباؤ ہوتا ہے کہ ممبر کو عوام کی مرضی کو نظر انداز کر جانا پڑتا ہے۔

(۴) یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ممبر اپنے حلقے کی اکثریت کی رائے سے متفق نہ ہو اور ان کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کرے۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس طرح ممکن ہے وہ کسی ایسے اقلیتی طبقے کی مرضی کی ترجمانی کر دے جس کی بات کہنے والا پارلیمان میں کوئی ممبر نہ ہو۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی قوم کے وسیع تر مفاد میں کسی مخصوص حلقے یا حلقوں کی اکثریت کی مرضی کو قربان کر دینا ضروری ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود انہی لوگوں کے آیندہ مفاد میں ایسا ہو۔ یعنی آج اگر اکثریت کسی چیز کو ناپسند کر رہی ہے تو ہو سکتا ہے آیندہ اس کے حق میں بہتر ثابت ہو جائے۔

بہر حال خلاصہ یہ کہ جہاں تک عوام کی مرضی کی ترجمانی کا تعلق ہے تو عملاً یہ ممکن ہی نہیں کہ ہر معاملے میں پارلیمان ان کی مرضی کے مطابق فیصلے کرے۔ یہ فیصلے اگر واقعی نیک نیتی کے ساتھ کوئی ممبر کرتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر وہ بدنیتی سے ایسا کرتا ہے تو یہ جمہوریت کے صریح منافی ہے۔ اور پھر عوام اس ممبر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، وہ جو جی چاہے کرے۔

یہ بھی جمہوریت کے بنیادی اصول اور اس کی روح کے خلاف ہے کہ منتخب ممبر اپنے حلقے کے ووٹروں کی نہ تو مرضی معلوم کرے اور نہ ان کی مرضی کی ترجمانی کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔ حقیقی جمہوریت تو جب ہی ممکن ہے کہ ہر ممبر اپنے حلقے کی مرضی کی ترجمانی کرے۔

ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ یہ عملاً ناممکن ہے۔ اس لیے نظام چلانے اور کبھی کبھی قوم کے مفاد کے خاطر بھی جمہوریت کے اس اصول کو بھی قربان کرنا پڑے گا۔

رہا اس کا علاج کہ ممبر اپنے ووٹروں کو دھوکہ نہ دے، ان کے مفاد کے خلاف ووٹ نہ دے، کسی بھی پارٹی کے دباؤ میں نہ آئے اور صحیح معنی میں اپنے حلقے کی نمایندگی کرتا رہے، تو صرف ایک ہی راستہ ہے وہ یہ کہ عوام ہر ممبر کو اس کی سیرت اور کردار کی بنیاد پر منتخب کریں۔ وہ اتنے پختہ کردار کے ہوں اور سمجھدار بھی ہوں کہ اپنے ذاتی مفاد کو بھی قربان کر سکیں اور پارٹی سے زیادہ اپنے ووٹروں کے وفادار ہوں۔

لیکن یہ علاج بھی بظاہر ممکن نہیں کیونکہ الیکشن عموماً پارٹی کی بنیاد پر لڑے جاتے ہیں اور افراد کی سیرت و کردار کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک امیدوار خود تو بہت اچھے کردار کا ہوتا ہے لیکن جس پارٹی سے وہ منسلک ہوتا ہے عوام اسے ناپسند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے ہیں اور اس لیے اسے ووٹ نہیں دیتے ۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عوام جس پارٹی کو پسند کرتے ہیں اس کا امیدوار عوام کے معیار پر پورا نہیں اترتا لیکن وہ پارٹی سے تعلق کی بنا پر مجبور ہوتے ہیں کہ اس امیدوار کو ووٹ دیں جسے وہ پسند نہیں کرتے ۔ اگر ایسا امیدوار کسی پارٹی سے منسلک نہیں ہوتا تو اگر وہ کامیاب ہو بھی جائے تو اس کی رائے اکثریت کے مقابلے میں بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے، ایک دقّت اور بھی ہے کہ بہت سے وہ لوگ جو واقعی اچھی سیرت کے مالک ہوتے ہیں اور اس بات کے اہل ہوتے ہیں کہ انھیں منتخب کیا جائے تو وہ ایمان داری سے کام کریں گے محض اس وجہ سے منتخب نہیں ہوسکتے کہ ان کے پاس الیکشن لڑانے کے وسائل نہیں ہوتے بہر حال یہ ہیں اس راہ میں عملی دشواریاں اور ان کو قبول کرنا ہی پڑے گا ۔

ایک تجویز یہ بھی رکھی جاتی ہے کہ ان ممبران پر روک لگانے کی ایک صورت یہ بھی ممکن ہے کہ الیکشن ہر سال ہوں، تاکہ ممبران پارلیمان کو یہ ڈر اور خوف رہے کہ اگر انھوں نے عوام کی خواہشات کو پامال کیا اور اختیارات کا غلط استعمال کیا تو آیندہ الیکشن میں عوام انھیں ووٹ نہیں دیں گے۔ اس لیے اس خوف کی بنا پر وہ عوام کی مرضی کی نمایندگی کرنے پر مجبور رہیں گے ۔

یہ تجویز ہے تو اچھی لیکن پھر وہی بات کہ عملاً ناممکن ہے ۔کیوں کہ، اس طرح ہر سال ملک کی بے پناہ دولت الیکشن پر صرف ہوگی اور بالآخر عوام ہی کو اس کا بوجھ اٹھانا ہوگا ، طرح طرح کے ٹیکس لگیں گے اور عوام چیخ اٹھیں گے ۔اس کے علاوہ ایک سال کی مدت بہت کم ہوتی ہے برسر اقتدار پارٹی اتنی قلیل مدت میں اپنے وعدوں اور تجاویز کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے گی اس لیے اس کی کارکردگی کا صحیح جائزہ لینا ممکن ہی نہیں ہوگا ۔نئی حکومت کو اتنا وقت تو ملنا ہی چاہیے کہ وہ اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنا سکے ۔ ان دونوں وجوہ کی بنا پر سالانہ الیکشن نہیں ہوسکتا ۔

اگر سالانہ الیکشن سے جمہوریت کو تقویت ملتی ہے اور اس کی کوئی اہم شرط پوری ہو بھی جاتی ہے تو یہ بھی تو دیکھئے ملک وقوم اور عوام کا کتنا سرمایہ اس میں صرف ہو جائے گا ۔اس لیے اگر عوام کے مفاد میں جمہوریت کے اس اصول کو قربان کرنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں کیوں کہ بقول براؤن جمہوریت جمہور کے لیے ہے نہ کہ جمہور جمہوریت کے لیے ۔محض جمہوریت کی ایک شرط پوری کرنے کے لیے اتنا سرمایہ صرف کرنا دانشمندی نہیں ۔ اس لیے عام طور پر پانچ سال کی مدت کو مناسب سمجھا گیا ہے اور بیشتر ممالک میں ہر پانچ سال بعد الیکشن ہوتے ہیں ۔ اب اس میں فائدے ہوں یا نقصانات اسی کو بہر حال قبول کرنا ہوگا ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مجلس عاملہ اور پارلیمان کا تعلق

یہ تو ہوئی صورت حال پارلیمان کی جو ملک کے لیے قوانین وضع کرتی ہے، لیکن کس حد تک جمہور کی مرضی کے مطابق وہ قوانین وضع کرتی یا کر سکتی ہے یہ آپ نے دیکھ لیا۔ اب لیجئے اس شعبے کو جو ان قوانین کو نافذ کرتا ہے، وہ کہاں تک عوام کی مرضی کے مطابق کرتا ہے یا کر سکتا ہے، ملاحظہ فرمالیں۔

معاملے کی نوعیت یہ ہے کہ انسانی زندگی کے بہت سے شعبے ہیں، معاشرے کی بے شمار ضروریات ہیں، حکومت کی ذمہ داریاں بھی بہت ہیں۔ زندگی کے ہر ہر شعبے میں نظم وضبط قائم کرنے کے لیے قوانین بن جانے کے بعد ان کو نافذ کرنا بھی ضروری ہے۔ ظاہر ہے ایک شخص تمام محکموں کو نہیں چلا سکتا اس لیے ایک عملے کی ضرورت ناگزیر ہے جو زندگی کے مختلف شعبوں میں توازن اور نظم وضبط قایم رکھ سکے مثلاً زراعت، صنعت، تجارت، تعلیم، صحت، ڈاک تار، سماجی فلاح، اندرونی انتظام، دفاع، بیرونی تعلقات وغیرہ۔ اس لیے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا کہ ان محکموں کا انتظام متعدد وزیروں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ ان میں جو اہم وزیر ہوتے ہیں ان کی مجلس کو کابینہ (Cabinet) کہتے ہیں۔

جو لوگ وزیر بنائے جاتے ہیں وہ پارلیمان کے ممبر ہوتے ہیں یعنی جمہور کے منتخب نمائندے۔ ان کا تقرر وزیر اعظم کرتا ہے اور وزیر اعظم اس پارٹی کا سربراہ ہوتا ہے جس کی پارلیمان میں اکثریت ہوتی ہے، چونکہ وزیر کی حیثیت سے تقرر نہ تو عوام براہ راست کرتے ہیں نہ ان سے مشورہ ہوتا ہے اس لیے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ تقرر بھی غیر جمہوری ہے۔ بہرحال ہوتا یوں ہی ہے۔

یہ تمام وزرا، یعنی پوری کابینہ اپنی کارکردگی کے لیے پارلیمان کے روبرو جوابدہ سمجھی جاتی ہے کہا جاتا ہے، پارلیمان ہی گویا ان کا تقرر کرتی ہے، وہی انھیں اختیارات سونپتی ہے، وہی ان کے کام کی نگرانی کرتی ہے اور اگر کسی بھی وزیر کی طرف سے کوتاہی یا لاپرواہی ہوتی ہے تو پارلیمان میں اس سے جواب طلب ہوتا ہے۔

اگر کسی وزیر کا کام قابل اطمینان نہیں تو وزیر اعظم اس وزیر کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر سکتا ہے۔ نیز پارلیمان میں اس کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پاس ہوگئی تو نہ صرف اس وزیر کو بلکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تمام وزیروں کو مستعفی ہونا پڑے گا، اس لیے پارلیمان میں سوالات کی بھرمار، برطرفی، عدم اعتماد کا ووٹ، پریس میں ہنگامہ، ملک میں بدنامی، آیندہ الیکشن میں منتخب نہ ہونے کا خوف، یہ تمام چیزیں وزیروں یعنی مجلس عاملہ کو پارلیمان کے کنٹرول میں رکھتی ہیں۔

لیکن یہاں پھر وہی مسئلہ درپیش ہے یعنی ان چیزوں پر عمل کہاں تک ہوتا ہے کیا واقعی عوام کے نمایندے عوام ہی کے مفاد کی خاطر مجلس عاملہ کو کنٹرول کرتے اور وہ حربے استعمال کرتے ہیں جو قانون نے ان کے ہاتھوں میں دے رکھے ہیں؟

کہا جاتا ہے کہ اصولاً مجلس عاملہ پارلیمان کے سامنے جوابدہ ہے۔ یعنی پارلیمان کا کوئی ممبر کسی بھی وزیر سے جواب طلب کرسکتا ہے۔ ممبروں کو وزراء سے شکایت ہوتی ہے اور وہ جواب دینے کے لیے وزیر کو پارلیمان میں بلاتے ہیں۔ لیکن عام طور پر وزیر آسانی سے قابو میں نہیں آتا۔ اول تو وہ خود پارلیمان میں ایسے موقع پر آتا ہی نہیں بلکہ اپنے انڈر سکریٹری کو بھیج دیتا ہے اور وہ بات کو گھما پھرا کر معاملے کو الجھا دیتا ہے اور وزیر پر آنچ تک نہیں آنے دیتا۔

دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر وزیر کو مجبوراً آنا ہی پڑ گیا تو وہ بھی اپنے فن میں ماہر ہوتا ہے یا ہو جاتا ہے اور شاطرانہ اور ڈپلومیٹک جوابات دے کر جواب طلب کرنے والوں کو خاموش کر دیتا ہے مثلاً اس معاملہ پر زیادہ بتانا ملک کے مفاد میں نہیں، ابھی اس معاملے کی تفصیلات واضح نہیں ہیں۔ اس طرح وزیر سوالات کی بوچھاڑ سے صاف بچ کر نکل جاتا ہے۔

اگر کوئی معاملہ بہت سنگین ہے یا بنا دیا گیا ہے تو وزیر کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کیا جاسکتا ہے۔ اگر پارلیمان میں اکثریت نے وزیر یا کابینہ کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر دیا تو پھر پوری کابینہ کو استعفیٰ دینا پڑے گا اور ملک میں دوبارہ انتخابات ہوں گے۔

کہا جاتا ہے حکومت اس حربے سے بہت خائف رہتی ہے اور پارلیمان کی گرفت میں رہتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ عدم اعتماد کا ووٹ شاذ و نادر ہی پاس ہوتا ہے کیوں کہ پارلیمان میں جس پارٹی کی اکثریت ہوتی ہے اسی کے وزراء بھی ہوتے ہیں اور پارٹی کے ممبر اس کی حمایت کرتے ہیں اس لیے اکثریت عدم اعتماد کا ووٹ پاس نہیں ہونے دیتی۔

اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ کابینہ ہی دراصل پارلیمان پر غالب رہتی ہے اور کابینہ کا سربراہ وزیر اعظم ہوتا ہے جس کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ مشورہ تمام وزیروں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کرتا ہے لیکن عملاً حکومت کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں رہتی ہے۔

یہی وہ نازک مقام ہے جہاں جمہوریت اور شخصی حکومت کی سرحدیں بہت قریب ہوجاتی ہیں۔ اگر اس کی پارٹی کے ممبران بالخصوص کابینہ کے وزرا موثر رول ادا نہیں کرتے اور وزیراعظم کی شخصیت میں گم ہوجاتے ہیں اور اس کے ہر اقدام کو خواہ غلط ہی کیوں نہ ہو سراہتے رہتے ہیں تو پھر یہی وزیراعظم جمہوریت کی علامت کی بجائے ایک مطلق العنان فرماں روا بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اس کی پارٹی کے لوگ ایمان دار ہوں، ملک و قوم کی بھلائی کے خواہاں ہوں اور وزیراعظم کو صحیح مشورے دیں، اس کی کارکردگی پر کڑی نظر رکھیں تو وہ انھیں نظرانداز نہیں کرسکے گا اور اس طرح چاہے جمہوریت کی بہت سی ظاہری رسمیں پوری نہ ہوں لیکن اس کی روح باقی رہے گی۔

اسلام میں اقتدار کا مالک اللہ تعالیٰ ہے

اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ انسان تو کیا کوئی ہستی بھی اس کی مستحق ہے نہ اہل کہ دوسروں پر فرماں روائی کرے، اپنی مرضی کے مطابق قانون بنائے اور دوسرے اس کی اطاعت کریں، ظاہر ہے کہ حق صرف اسی کو حاصل ہے جس نے اس کائنات کو بنایا ہے، جو اس کا مالک ہے اور جس کی فرماں روائی کائنات کے ذرّے ذرّے پر ہے۔ لیکن، جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، جمہوری نظریہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی رو سے ہر ملک کے عوام ہی حاکم اعلیٰ ہیں لیکن یہ نظریہ اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ کہ حاکم اعلیٰ اس ہستی کو کہتے ہیں جس کے اختیارات لامحدود ہوں، جو خود مختار ہو، جو اپنی لامحدود طاقت کی بنا پر ہر ایک پر حکمراں ہو، جس پر کوئی حاکم نہ ہو، جو کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو، جو کسی کا محتاج نہ ہو، اور جس کو فرماں روائی کا حق مالک ہونے کی بنا پر حاصل ہو، کسی کا دیا ہوا نہ ہو۔

اس اعتبار سے تو یہ حق کسی ملک کے لوگوں کو تو کیا ساری دنیا کے انسانوں کو بھی حاصل نہیں کیوں کہ یہ ایک ذرے کے بھی خالق نہیں اور قدم قدم پر حالات اور ایک ماورائی طاقت کے سامنے مجبور و محکوم نظر آتے ہیں۔ اس لیے عوام کو حاکم اعلیٰ نہیں کہا جاسکتا۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ عوام کو کسی ماورائی طاقت نے حکومت کا حق دیا ہو، یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بات اس لیے تسلیم نہیں کی جاسکتی کیوں کہ یہ عوام کے "اقتدارِ اعلیٰ" کے منافی ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ عوام کسی ماورائی طاقت کی طرف سے حاکم بنائے گئے ہیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ عوام سے اوپر بھی کوئی طاقت ہے، جس کے سامنے عوام جوابدہ ہیں اور یہ جمہوریت کے بنیادی اصول یعنی "عوام کے اقتدارِ اعلیٰ" کے خلاف ہوگا۔

اگر عوام کو کسی دوسرے مفہوم میں "حاکم اعلیٰ" مانا جاتا ہے تو وہ یہاں زیر بحث نہیں بہرحال اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ حکومت کا اختیار اس کائنات کے خالق و پروردگار ہی کے ہاتھ میں ہے اور حکومت کی علامت ہے فرمان جاری کرنا، قانون بنانا۔ اس اعتبار سے قانون بنانے کا حق کسی مخلوق کو حاصل نہیں، یہ حق صرف اللہ کا ہے۔

خلیفہ نائب ہے نہ کہ خودمختار

پس اسلامی نقطۂ نظر سے اصل حاکم تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، لیکن بعض تکوینی مصلحتوں کی بنا پر اس نے اپنے قوانین و فرامین بعض مخصوص انسانوں پر نازل فرمائے اور ان ہی کے ذریعہ نافذ بھی فرمائے ہیں۔ یہ مخصوص انسان انبیاء کے نام سے مشہور رہے ہیں جنھوں نے ہمیشہ یہی اعلان کیا ہے کہ حاکم تو صرف اللہ ہے، ہم اسی کے محکوم ہیں اور اسی کے قوانین نافذ کرنے پر مامور ہیں اور اسی کی مرضی کے مطابق معاشرے کا انتظام کرنا چاہتے ہیں۔

ان کا یہ دعویٰ ایک اقلیت نے ضرور تسلیم کیا لیکن اکثریت یہی کہتی رہی ہے کہ ہماری نظر میں تو تم خود ہی اپنی طرف سے احکام و قوانین پیش کر رہے ہو، اللہ نے تمھیں اپنا نائب یا نمایندہ نہیں بنایا۔

اس معاملے میں جمہوری نقطۂ نظر یہ ہے کہ عوام چونکہ اپنے اقتدار اور طاقت کا استعمال و اظہار بلاواسطہ خود نہیں کر سکتے اس لیے یہ حق (یعنی حکومت کرنے کا حق) اپنے نمایندوں کے سپرد کر دیتے ہیں[1]، اور یہ نمایندے اصلی "حاکم اعلیٰ" (یعنی عوام) کی مرضی کی ترجمانی کرنے پر مامور ہوتے ہیں اور

---

[1] بظاہر یہاں اسلامی نظریۂ نمایندگی اور جمہوری نمایندگی میں یک گونہ مماثلت نظر آتی ہے، یعنی یہ کہ "اسلامی حکام" بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم حاکم اعلیٰ کے نمایندے ہیں اور جمہوریت کے تحت حکام بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم "حاکم اعلیٰ" کے نمایندے ہیں، لیکن یہاں ایک بنیادی فرق بھی ہے، وہ یہ کہ عوام جنھیں حاکم اعلیٰ تسلیم کیا جاتا ہے اپنی طاقت کا استعمال و اظہار کر ہی نہیں سکتے یعنی ملک کا ہر فرد حکمراں نہیں بن سکتا (اگر بن گیا تو کس پر حکومت کرے گا؟) اس کے برعکس اسلام جسے "حاکم اعلیٰ" تسلیم کرتا ہے وہ =

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عوام ہی کے سامنے جوابدہ سمجھے جاتے ہیں۔

لیکن اس معاملے میں بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ اختلاف رائے ہے، اور اکثر لوگوں کا کہنا یہی ہے کہ یہ "نمائندے" کسی طرح بھی عوام کے نمائندے نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کی مرضی کے ترجمان ہوتے ہیں[۱] بلکہ اپنی مرضی سے قوانین بناتے اور نافذ کرتے ہیں، اگرچہ کہتے یہی ہیں کہ ہم "حاکم اعلیٰ" کی مرضی کے ترجمان ہیں۔

جمہوری اور اسلامی نظام میں یہ فرق بہت واضح ہے کہ "اقتدار اعلیٰ" کے مالک عوام اپنی طاقت کا استعمال نہیں کر سکتے اور اس کے اظہار کے لیے اپنے نمائندے منتخب و مقرر کرنے کے محتاج ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ ہر حال میں حاکم ہے، اپنے نمائندے مقرر کرنے سے پہلے اس کی حکومت جس طرح تھی اسی طرح نمائندے مقرر کرنے کے بعد بھی رہتی ہے، اس سے اس کی فرماں روائی میں فرق نہیں آتا۔

دوسری بات یہ کہ جمہور کے نمائندے عام طور پر اپنے "حاکم اعلیٰ" کی مرضی کے خلاف عمل کرتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ کے منتخب و مقرر کردہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ اس کی مرضی کے ترجمان رہے ہیں کیونکہ وہ عالم الغیب ہے، مستقبل کے بارے میں بھی اسی طرح جانتا ہے جس طرح ماضی کے بارے میں اس لیے اس منصب پر اس نے ہمیشہ بہترین انسانوں ہی کا تقرر فرمایا ہے جو ہمیشہ اس کے وفادار بندے ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن جب معاملہ خلیفہ یا "امیر المومنین" کا آجاتا ہے تو نوعیت بدل جاتی ہے۔

اسلامی کی تاریخ میں منصب خلافت اس وقت اور بھی ابھر کر سامنے آگیا تھا جب اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تھا۔ اس وقت آپؐ کے صحابہ کو شدت کے ساتھ اس کا احساس ہو رہا تھا کہ کوئی شخص آپؐ کی خلافت کا منصب سنبھالے۔

= واقعی حکومت کر رہا ہے اور ذرہ ذرہ پر فرماں روائی کر رہا ہے، اس کی حکومت ابدی ہے، وہ نمائندے مقرر کرنے سے پہلے بھی حکمراں تھا اور بعد میں بھی اسی طرح حاکم ہے۔

[۱] اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ درحقیقت کسی بھی ملک کے لوگ جنگ اور اس کی ہولناک تباہیوں کے متمنی نہیں، لیکن دنیا ہر روز ایک تباہ کن جنگ کے قریب بڑھتی جارہی ہے۔ تباہی کے اس غار کی طرف کون دھکیلے لیے جارہا ہے؟ کیا دنیا کے عوام کی یہی مرضی ہے؟ اگر نہیں تو پھر یہ حکمراں عوام کی مرضی کے مطابق حکومت کر رہے ہیں؟ کیا یہ عوام کے ترجمان ہیں؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کا تقرر ہوگیا اور پھر یہ سلسلہ شروع ہونے کے بعد صدیوں تک چلتا رہا۔

بالکل ابتدائی دور ہی سے خلفاءؓ، صحابہؓ اور مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات واضح تھی کہ خلیفہ سے کیا مراد ہے، اس کے منصب کی کیا اہمیت ہے، خلیفہ کے اختیارات کیا ہیں، اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں اور مسلمانوں کے اس سلسلے میں کیا فرائض اور ذمہ داریاں ہیں۔ وہ جانتے تھے خلیفہ وہ تمام امور انجام دے گا جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات مبارکہ میں انجام دیتے رہے تھے، یعنی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دستور کو نافذ کرنا اور اس کے دائرۂ نفاذ کو وسیع کرنا۔ یہ دستورِ الٰہی بہ شکل قرآن مرتب و مجلد موجود تھا، اس کی لفظی تشریح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال (یعنی حدیثوں) کی شکل میں موجود تھی اور اس کا عملی نمونہ خود آپؐ کی سیرت اور آپ کے قائم کردہ نظام میں موجود تھا۔ بالفاظ دیگر منصب خلافت کی نوعیت اور ذمہ داری وہی تھی جو اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں کی رہی تھی البتہ چند اہم تبدیلیاں ہوگئی تھیں۔ پہلی تو یہ کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہوچکا تھا یعنی اللہ تعالیٰ کے دستور کو نافذ کرنے والوں کا براہِ راست اللہ کی طرف سے تقرر ہونے کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا، اور اب اس منصب پر انسانوں کے ذریعہ تقرر ہونے لگا۔

دوسری یہ کہ پہلے اللہ تعالیٰ اپنے قوانین بلاواسطہ یا صرف فرشتے کے ذریعہ نازل فرماتا رہا تھا۔ اب یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ اب خلیفہ کی راہ نمائی کے لیے ایک مکمل اور جامع دستور بہ شکل قرآن اور خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تھی اور ان ہی کی روشنی میں دستورِ الٰہی کو نافذ کرنا تھا۔ چنانچہ آپؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ اور ان کے بعد اور بھی بہت سے خلفاء نے یہ کام بخوبی انجام دیا۔

اسلام اور جمہوریت کا موازنہ

بدلتے ہوئے حالات اور وقت کے تقاضوں کے پیش نظر علمائے کرام اور مفکرین اسلام نے سیاست کو موضوع بنا کر خلافت کے اصول بھی مدوّن کیے۔ یہاں ان سب کا تفصیلی بیان تو ممکن نہیں البتہ ہم ان بنیادی اصولوں کا مختصر جائزہ پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے جمہوری نظام اور اسلامی نظام کے تقابلی مطالعے میں مدد مل سکے۔

(۱) جمہوری نظام میں مملکت کا سربراہ عوام کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلام میں خلیفہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عوام کا نمایندہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب یا نمایندہ ہوتا ہے، اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی مرضی کی ترجمانی کرنے پر مامور ہوتا ہے، نہ کہ "امت" کی مرضی کی۔

(۲) اسلامی نظام کی رو سے شرعی قانون کو بالادستی حاصل ہوتی ہے، قرآن کو اللہ تعالیٰ کا قانون مانا جاتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کا مظہر ہے۔ خلیفہ اسی کا پابند ہوتا ہے اور اسی کی پابندی کا عہد کرتا ہے، اسی کو نافذ کرنے کا اقرار کرتا ہے اور امت اسی قانون کی پابندی کا عہد کرتی ہے یعنی بیعت میں اسی کا عہد کرتی ہے۔

جمہوری نظام میں ایک مرتب دستور ہوتا ہے، یہ دستور ملک کے "اقتدار اعلیٰ" یعنی عوام کے اقتدار اور ان کی مرضی کا مظہر ہوتا ہے اور عوام اور اس کے نمایندے اسی دستور کی پابندی کا اقرار کرتے ہیں[1]

(۳) اگر کوئی خلیفہ انتخاب کے بعد اپنی ذاتی زندگی میں دستورِ الٰہی کی پابندی نہیں کرتا لیکن دوسروں کو اس دستور کے خلاف حکم بھی نہیں دیتا تو ایسے خلیفہ کی بہر حال اطاعت کی جاتی رہے گی بالخصوص جب کہ اس کو برطرف کرنے میں زیادہ فساد اور خانہ جنگی کا اندیشہ ہو، یہی معاملہ اس خلیفہ کے ساتھ رہے گا جو اپنی طاقت کے بل پر خلیفہ ہو جائے۔ امت کا یہی عمل بھی رہا ہے[2]۔

جمہوریت میں بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی رہتی ہے۔ اگر حکومت عوام کی مرضی کی خلاف ورزی کرنے لگے تو عوام اس کو بزور ہٹا نہیں سکتے۔ انھیں انتظار کرنا پڑے گا کہ کب موجودہ حکومت ختم ہو اور پھر دوسری حکومت قایم ہو۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح لوگ ایک بادشاہ یا خلیفہ کی موت یا اس کی برطرفی کے منتظر رہتے تھے۔

(۴) براہِ راست عوام تو کیا خواص بھی اپنی پسند کا متفقہ طور پر خلیفہ منتخب نہیں کر سکتے ان میں یقیناً اختلاف رائے ہو گا، نتیجہ میں تصادم اور پھر خوں ریزی کا سلسلہ شروع ہو جائے جو نہیں کہا جا سکتا کب ختم ہو گا۔

اسلام میں اسی صورت کو ترجیح دی گئی ہے کہ امت کے سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار افراد، جن کی سیرت قرآن و حدیث سے زیادہ قریب ہو، معتمد سمجھے جائیں وہ

---

[1] یہ دستور عوام کی مرضی سے بدلا بھی جا سکتا ہے لیکن اس کی شکل خواہ کچھ بھی رہے قوم اسی کی وفادار سمجھی جاتی ہے۔
[2] یہ بات جس انداز میں کہی گئی ہے اس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ (جلال الدین عمری)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باہمی مشورے سے کسی بہترین فرد کا انتخاب کریں۔ یہ اصول حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلیفہ کے انتخاب کا جو طریقہ تجویز کیا تھا اس سے بالکل واضح ہے۔

لیکن جمہوریت میں نمایندگی اور اعتماد کا معیار "تقویٰ" نہیں بلکہ کثرتِ ووٹ ہے اور مختلف پارٹیوں کا میدان میں آنا اور الیکشن لڑنا جمہوریت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

(۵) اسلام نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی کہ لوگ مناصب کی خواہش وطلب کے ساتھ میدان میں آئیں اور پھر انھیں مناصب دیئے جائیں۔

جمہوریت میں یہ لازمی ہے۔

اسلام کے سیاسی نظام اور موجودہ جمہوریت کے درمیان پائے جانے والے بعض نمایاں اختلافات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ تفصیلات سے بحث نہیں کی گئی ہے۔

اسلامی معاشرت پر مولانا سید جلال الدین عمری کی تصنیفات

عورت۔ اسلامی معاشرہ میں

عورت دورِ قدیم میں۔ عورت دورِ جدید میں۔ اسلام میں عورت کا مقام۔ عورت کا دائرہ کار۔ جنسی تعلقات کی اجازت اور اس میں حدود کی پابندی یہ ہیں بعض وہ موضوعات جن سے اس علمی وتحقیقی کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ ہندوستان وپاکستان سے اس کے ایک درجن سے زیادہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

قیمت ۲۵ روپئے

مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ

کتاب وقت کی اہم ضرورت پوری کرتی ہے۔ اس کے بعض عنوانات سے اس کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ عورت کا معاشی مسئلہ۔ مہر کے احکام۔ تعددِ ازواج۔ طلاق کا مسئلہ۔ مطلقہ کا نفقہ۔ خلع کی نوعیت۔ عورت کا حق وراثت۔ قیمت ۲۰ روپے لائبریری ایڈیشن ۲۵ روپئے

ملنے کا پتہ

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور علی گڑھ

© rasailojaraid.com